eISSN:2073-3674
pISSN:1991-7813

CC BY

OPEN ACCESS

جدید فکری مباحث اور علامہ شبلی نعمانی

Modern Intellectual Discussions and Allama Shibli Nomani

ڈاکٹر شاہدہ رسول، اسسٹنٹ پروفیسر، ویمن یونیورسٹی، ملتان

Dr. Shahida Rasool
Assistant Professor, Women University, Multan
Email: shahidrasool9@gmail.com

ڈاکٹر زینت افشاں، اسسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، فیصل آباد کیمپس

Dr. Zeenat Afshan
Assistant Professor, University of Education, Faisalabad Campus
Email: zeenat.afshan@yahoo.com

محمد فاروق بیگ، لیکچرار، شعبہ اردو، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس

Muhammad Farooq Baig
Lecturer, Riphah International University, Faisalabad Campus
Email: farooqbaig@hotmail.com

Received: 20-2-2022 **Accepted:** 11-3-2022 Online**:** 28-6-2022

ABSTRACT

In the nineteenth century after the advent of colonialism in the subcontinent, the local intellectuals dispersed, especially the Muslims. Sir Syed Ahmad Khan and his companions advised Muslims to attach with modern learning. Shibli Nomani was impressed by Sir Syed's ideas. He too became his admirer but his point of view was different in the sense that he wanted to instil the future in the bright past. He presented his own ideas in the light of the glorious past of the Muslims. In this essay, his personality has been discussed with respect to both aspects and specifically on his modern thoughts despite his liking for the past. Shibli Nomani, in general, is considered a religious leader but in this paper, it has been proved through his letters and literature that he accepted colonialism as well and asked the Muslims to do the same as Sir Syed Ahmad Khan taught them to.

KEYWORDS: Shibli Nomani, Modern, Intellectual, Ideas, Discussions, 19th Century, Sub-continent, Colonialism

کلیدی الفاظ: شبلی نعمانی، جدید، فکری، مباحث، انیسویں صدی، برصغیر، نوآبادیاتی نظام

برصغیر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی مذہبی، سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کا مطالعہ ہمیں 1857ء یعنی انیسویں صدی کے وسط اور بیسویں صدی تک لے جاتا ہے۔ یہ ڈیڑھ صدی جہاں ہندوستان کے زوال و انحطاط کی داستان پیش کرتی ہے وہاں فکری اعتبار سے بہت زرخیز ہے مگر ہمارا موضوع بحث انیسویں صدی کے وسط اور بیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ ہے۔ جدیدیت کو ایک پس منظر کے طور پر دیکھتے ہوئے ہمیں شبلی نعمانی کے جدید افکار و خیالات کا جائزہ لینا ہے جو اپنے خیالات کے اعتبار سے جدید و قدیم کے امتزاج کے حامل ہیں۔ شبلی کے وہ نظریات جو دراصل ان کی عقل پرستی پر دلالت کرتے ہیں اور جن کو کم ہی لوگوں نے موضوع بحث بنایا ہے ہمارے پیشِ نظر ہوں گے مگر شبلی نعمانی کے ان جدید افکار پر تنقید و تبصرے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اردو ادب میں جدیدیت کے آغاز پر روشنی ڈالیں۔

جب ہم لفظ ''جدید'' استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کچھ نظریات و خیالات ایسے تھے جنہیں روایتی یا قدیم خیالات و تصورات کا نام دے کر رد کیا جاچکا ہے۔ رد و قبول کا یہ عمل برصغیر میں مرزا اسد اللہ خان غالب سے شروع ہوتا ہے جنہوں نے نہ صرف خود اپنے کلام کو جدید دور کا ترجمان کہا بلکہ اپنے خطوط اور بالخصوص اپنی فارسی تصنیف ''دستنبو'' میں وہی خیالات و افکار پیش کیے جن کا پرچار بعد میں سرسید نے کیا مگر غالب کے ان جدید خیالات کے باوجود اس وقت جدیدیت کسی اصطلاح کے طور پر رائج نہیں تھی۔ اسی زمانے میں دلی کالج قائم ہوا جس میں انگریزی تعلیم کو باقاعدہ رائج کر دیا گیا اور نو آبادیاتی نظام کے اثرات دلی کالج کے طالب علموں کے ذہن و دماغ پر محسوس ہونے لگے گویا یہ وہ ماحول تھا جس نے آہستہ آہستہ قدیم تصورات کو رد کرنے اور جدید اثرات کو قبول کرنے کے لئے زمین ہموار کی۔ برطانوی تسلط بالآخر اس انقلاب کا سبب ہوا جس کو ہم انقلاب ستاون، غدر یا غالب کے الفاظ میں رُستہ خیز بیجا کا نام دیتے ہیں۔ اس سارے پس منظر میں جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ اردو ادب میں جدیدیت کا آغاز انیسویں صدی سے ہوتا ہے مگر مفکرین ادب کا ایک گروہ اسے پوری انیسویں صدی پر محمول کرتا ہے اور دوسرے گروہ کے نزدیک اس کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر میں ہوا۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی لکھتے ہیں:

> ''اگر ہم یک زمانی فکر کو تحقیق و تصنیف کے لیے چھوڑ کر تحقیق کے دوزمانی اصول کی جانب متوجہ ہوں اور یہ جاننا چاہیں کہ جدید یا ماڈرنزم کا نظریہ یا رجحان یا تحریک کب شروع ہوئی تو ہمیں اپنی صدی سے پیچھے انیسویں صدی میں جانا پڑے گا''۔(۱)

رجحان پہلے شروع ہوتا ہے بعد میں یہی رجحان تحریک کو جنم دیتا ہے۔ رجحان کے اعتبار سے تقریباً ساری انیسویں صدی کو ہم جدیدیت کی جانب رواں دواں دیکھتے ہیں اور انیسویں صدی کے آخری حصے سے تحریکوں اور نظریہ سازی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> "شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی روایت کے تناظر میں جدیدیت ایک ذہنی اور تخلیقی رویے کا اشاریہ ہے۔ تجدد پرستی کے مضمرات تاریخی اور مذہبی ہیں چنانچہ ایک اصطلاح کے طور پر اسے سب سے پہلے انیسویں صدی کے اواخر میں کیتھولک عقائد کی قدامت پرستی کے خلاف روشن خیالی کی ایک تحریک کے پس منظر میں برتا گیا"۔(۲)

انیسویں صدی میں تنقید، تنقیص، مخالفت، بغاوت ہر چیز اپنے عروج پر تھی کیونکہ برطانوی تسلط اور مغل حکمرانوں کی بے عملی نے مسلمانان برصغیر کو ذہنی و روحانی اعتبار سے پسپا کر دیا تھا اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد پسپائی کا یہ احساس اور یاسیت پسندی اس قدر بڑھ گئی کہ برصغیر کے مقامی لوگ بے عملی کا شکار ہو کر تن بہ تقدیر ہو گئے۔ تساہل پسندی اور یاسیت کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مستشرقینِ یورپ نے کمال ہوشیاری اور چالاکی سے برصغیر کے تمدن اور معاشرت اور اسلام کے مشاہیر و اکابر کی ایسی تصویر دنیا کے سامنے پیش کی کہ برصغیر کے عام لوگ بالعموم اور مسلمان بالخصوص اپنے ماضی سے متنفر ہو گئے۔ اس بدعقیدگی منتشر خیالی اور انحطاط نے سرسید احمد خان جیسے مجدد کو جنم دیا جس کے افکار و خیالات کو رد بھی کیا گیا اور بڑی حد تک لوگوں نے ان خیالات یا نئی سوچ کا اثر قبول کر کے اس دور میں درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے فکر و عمل میں جدت پیدا کی۔

سرسید احمد خان اگرچہ بظاہر تقلید کی روش کو پسند نہیں کرتے تھے تاہم انہوں نے دوسری قوموں کے اثرات قبول کیے اور مسلمانانِ ہند کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی اور نو آبادیاتی نظام کے زیر اثر رہتے ہوئے اہل یورپ کو ہر اعتبار سے مشرقی اقوام سے بہتر گردانا۔

اگر ہم سرسید کے افکار و خیالات کا مفصل جائزہ پیش کریں تو بات بے جا طوالت اختیار کر سکتی ہے مگر مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرسید احمد خان نے عقل پرستی کی جس روایت کو فروغ دیا اس نے روایت پرست مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو شدید زک پہنچائی کیونکہ سرسید احمد خان نے قرآن پاک کی تفسیر کچھ اس انداز سے کی جس سے علماء اور مفکرین آج تک متفق نہیں ہو سکے۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شدید مشکلات کے اس دور میں اگر سر سید احمد خان جیسا روشن خیال اور مصلحت اندیش مفکر جنم نہ لیتا تو مسلمان شاید اس انحطاط اور بے عملی سے کبھی باہر نہ نکل سکتے۔

اس مقالے میں بنیادی طور پر علامہ شبلی نعمانی کے افکار اور خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس امر کا کھوج لگایا گیا ہے کہ شبلی جنہیں سر سید احمد خان سے شدید نظریاتی اختلاف تھا مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کے لئے مذہبی تعلیمات کی باز آفرینی کے خواہاں تھے یا نو آبادیاتی نظام نے ان کی فکر میں جدت پیدا کی تھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شبلی نعمانی نے فرسودہ روایات کی بیخ کنی کے لئے جو دلائل پیش کیے ان کا منطقی جواز مذہب اسلام میں ڈھونڈا یا ان کی یہ کوشش اجتہاد کی طرف پہلا قدم تھی۔

شبلی نعمانی کو مہدی الافادی نے اردو ادب کے عناصر خمسہ میں شمار کیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ سر سید کے بعد تحقیق و تنقید اور جدت پسندی میں شبلی نعمانی کا نام سر فہرست ہے۔ اگرچہ علی گڑھ تحریک سے وابستہ ہونے سے پہلے شبلی نے حدیث اور قرآن کے علوم حاصل کر لیے تھے اور والد کے کہنے پر وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا مگر سر سید تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد شبلی کی تحقیقی اور تصنیفی سر گرمیوں کا رخ یکسر بدل گیا۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل رقم طراز ہیں:

> ''جس وقت شبلی علی گڑھ کالج سے متعلق ہوئے ان کی نظم و نثر سے شعری اور ادبی خوبیاں عیاں تھیں لیکن ان کا غلط استعمال ہو رہا تھا۔ ان کی شاعری عشقیہ غزلوں کے لیے گویا وقف تھی۔ علی گڑھ جانے سے یہ سب کچھ بدل گیا۔ عشقیہ شاعری کی جگہ قومی نظموں نے لے لی۔ اس لیے کہ علی گڑھ سے صحیح معنوں میں فیض یاب ہونے اور سید احمد خان سے پوری طرح متاثر ہونے کا موقع انہیں یہاں ملا تھا۔ چنانچہ مسلمان کیا تھے اور کیا ہوں گے؟ یہ احساس ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا''۔(۳)

زمانہ معترف ہے کہ علامہ شبلی نعمانی ایک بلند پایہ نقاد، محقق، مورخ، سوانح نگار اور سیرت نگار ہیں۔ شبلی کی تحقیق و تصنیف کا موضوع تاریخ رہا مگر ان کی تاریخی اور سوانحی کتب کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شبلی جدید فکری رجحانات سے گریزیا ردِ عمل پیش کر رہے تھے مگر شبلی نو آبادیاتی نظام یا سر سید تحریک سے متاثر ہوئے۔ اس کا اندازہ ہمیں مقالاتِ شبلی اور کلام اور علم کلام کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ یوں شبلی کی جدید فکر کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1۔ جدید افکار و خیالات

2۔ تاریخ اور سیرت کی جدید انداز میں پیشکش یا اسلوب بیان میں جدت

سب سے پہلے ہم پہلے رجحان کا جائزہ لیتے ہیں جس کے تحت شبلی نہ صرف سر سید احمد خان بلکہ پورے نو آبادیاتی نظام سے متاثر دکھائی دیتے ہیں اور جو بالعموم شبلی کے نقادوں کی توجہ کا مرکز نہیں بنا۔

سر سید احمد خان نے اہل یورپ کے تہذیب و تمدن اور معاشرت کو ہر لحاظ سے بہتر خیال کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس تہذیب و تمدن اور معاشرت کے اختیار کرنے کی تلقین کی اور مستشرقین یورپ کی پیروی میں یہ بات تسلیم کر لی کہ مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی جو تصویر وہ پیش کر رہے ہیں وہ صداقت پر مبنی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شبلی کو سر سید احمد خان سے اسی بنیاد پر اختلاف تھا مگر ہم جس رخ سے شبلی کی حیثیت جدید مفکرین میں نمایاں کرنا چاہتے ہیں وہ بالکل مختلف ہے۔

شبلی نعمانی نے بھی سر سید کی پیروی میں مغربی اقوام کے تہذیب و تمدن کو اپنانا نہ صرف جائز سمجھا بلکہ تاریخ اسلامی سے اس مشابہت کا جواز بھی فراہم کیا۔ ایسا کرتے ہوئے شبلی کے پیش نظر بھی وہ احادیث رسولؐ تھیں جن میں غیر اقوام کی مشابہت سے منع کیا گیا تھا مگر شبلی نے قصداً ان احادیث سے تعرض کرتے ہوئے لکھا:

> ”حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی پیغمبر یا بانی مذہب کسی نئے مذہب کی بنیاد ڈالتا ہے تو اس کو خواہ مخواہ بعض ایسی مخصوص علامتیں قائم کرنی پڑتی ہیں جو اس کے پیرووں اور عام لوگوں میں امتیاز اور شناخت کا ذریعہ ہوں۔ اس قسم کی علامت کو ”شعار“ کہا جاتا ہے اور اردو میں اس کا ترجمہ ”وردی“ یا ”تمغہ“ کیا جا سکتا ہے۔ بے شبہہ جناب رسولؐ نے بعض چیزوں میں اس قسم کا امتیاز قائم کیا تھا اور ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ان باتوں میں غیر مذہب والوں کی مشابہت نہ اختیار کرو لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دوسری قوموں اور دوسرے مذہب والوں کی ہر بات سے اجتناب کیا جائے سخت غلطی ہے“۔(۴)

گویا شبلی یہ کہنا چاہتے تھے کہ جو علامات پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے دوسری قوموں پر فخر و امتیاز حاصل کرنے کے لیے وضع کی تھیں ان کو کوئی عقلی جواز نہیں تھا وہ خواہ مخواہ وضع کی گئی تھیں لہذا وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عہد رسالت میں ایسی مثالیں موجود تھیں مگر عوام چونکہ تاریخ سے ناواقف ہیں اس لیے وہ اس سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کی غلطیوں کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قدیم تعلیم میں تاریخ کا حصہ شامل نہ تھا اور اس وجہ سے اکثر مسلمان آنحضرتؐ اور خلفائے راشدینؓ اور صحابہؓ کے طرز معاشرت کے تفصیلی حالات سے بالکل آشنا نہیں۔ جس شخص نے سلف کی تاریخ سرسری نظر سے بھی پڑھی ہو گی وہ اس بات سے کیونکر انکار کر سکتا ہے کہ آنحضرتؐ اور خلفائے راشدینؓ نے تمدن اور معاشرت کے متعلق غیر قوموں کی بہت سی باتیں پسند فرمائیں“۔(۵)

مگر شبلی نعمانی کے لیے ان جدید خیالات کی ترویج دشوار تھی کیونکہ شبلی کا میدانِ تحقیق تاریخ اور وہ بھی مذہبی تاریخ تھا اس لیے روایت پرست علماء نے سرسید کی طرح شبلی پر بھی فتویٰ تکفیر جاری کر دیا تھا جس کی وجہ سے جدید تعلیم کے فروغ وارتقاء میں انہیں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”ہماری قوم میں نئے علوم وفنون اور نئے تمدن اور شائستگی کے نہ پھیلنے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں کا اب تک خیال ہے کہ ہم کو غیر قوموں کا تشبہ شرعاً ناجائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک قوم کے مقدس حضرات، یورپین علوم و فنون، یورپین زبان، یورپین تمدن، یورپین طرز معاشرت سے جہاں تک ہو سکتا ہے اجتناب کرتے ہیں اور بضرورت کوئی بات اختیار کرنی پڑتی ہے تو ان کا دل ان کو ملامت کرتا رہتا ہے“۔(۶)

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نوآبادیاتی نظام سے اثر پذیر ہوئے اور یورپ کی پیروی کے ایسے عقلی جواز تلاش کیے جن کی مدد سے ان کے موقف پر روشنی پڑے اور وہ ثابت کر سکیں کہ ان کے زمانے میں یورپ کی تقلید جائز ہے۔ ان عقلی دلائل نے اس زمانے میں جو اثرات مرتب کیے تھے ان سے قطع نظر اس صدی کی جدید مسلم دنیا ان افکار وخیالات کے منفی اثرات کی وجہ سے زوال وانحطاط کا شکار ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب عظیم کے بعد مسلمانوں کی ابتر حالت کو سنوارنے کے لیے سرسید احمد خان نے مسلمانوں کے ایک گروہ کو ”لائل محمڈن“ کا نام دیا تھا اور پھر تاحیات تمام مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ وفاداری کی تلقین کرتے رہے۔ شبلی نعمانی نے ان کے اس خیال کی بھی تائید کی اور مسلمانوں کو انگریزوں سے وفاداری کی نہ صرف تلقین کی بلکہ اس کے لیے جواز بھی فراہم کیے۔

شبلی کے نزدیک عہد رسالت میں بھی غیر مسلم حکومت سے وفاداری کی مثال موجود ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے حسب ذیل واقعہ بیان کیا ہے:

"مکہ میں جب مخالفین نے مسلمانوں کو حد سے زیادہ ستانا شروع کیا تو آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ لوگ ہجرت کر کے حبش ابن سینا کو چلے جائیں۔ چنانچہ بہت سے صحابہؓ چلے گئے۔ حبش کا بادشاہ عیسائی تھا، جس کو اہل عرب نجاشی کہتے تھے، صحابہ جب حبش میں آئے تو اتفاق سے چند روز بعد کسی بادشاہ نے اس ملک پر چڑھائی کی اور نجاشی نے اس کے مقابلے کے فوجیں بھیجیں۔ صحابہؓ نے خود بلا کسی تحریک کے اپنی طرف سے ایک قاصد بھیجا کہ وہ فوج کے ساتھ جائے اور دم دم کی خبریں بھیجتا رہے تا کہ ضرورت ہو تو خود ہم لوگ نجاشی کی مدد کو آئیں۔ صحابہؓ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پانچ وقت نمازوں میں نجاشی کی فتح کی دعائیں مانگتے تھے"۔(۷)

مگر یہاں شبلی خود غلطی کے مرتکب ہوئے وہ یہ بھول گئے تھے کہ نجاشی نے مسلمانوں کو مادی اغراض و مقاصد کی بناء پر پناہ نہیں دی تھی وہ ایک انصاف پسند حکمران تھا اس لیے جب کفار مکہ کی طرف سے ایک وفد نے مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا تو نجاشی نے مسلمانوں کا موقف سنا اور اس کے بعد جو فیصلہ کیا وہ مسلمانوں کے جاہ و جلال سے متاثر ہو کر نہیں کیا تھا بلکہ خالص روحانی بنیاد پر کیا تھا اس لیے ایسے انصاف پسند اور دوست حکمران کو مشکل وقت میں فوج سے مدد دینا یا نماز پنجگانہ میں اس کی فتح و نصرت کی دعا مانگنا صحابہ کرام کا اخلاقی فرض تھا۔ یہاں برصغیر میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ مسلمانوں کو جن آقاؤں کی وفاداری کا درس دیا جا رہا تھا وہ ظالم و جابر تھے۔ نجاشی کی طرح انصاف پسند نہیں۔ شبلی نے اس ضمن میں ایک مثال ہلاکو خان کی دی ہے۔ اس پر بحث و تبصرہ کرنے سے پیشتر شبلی کے خیالات کا مطالعہ مفید ہو گا۔ وہ لکھتے ہیں:

"تاتاری جس زمانہ میں ایران اور عراق پر قابض تھے اکثر بڑے بڑے عہدوں پر مسلمان ہی مامور تھے۔ ہلاکو خان کی سفاکی اور اسلام دشمنی مسئلہ عام تھا۔ بغداد جو مسلمانوں کے جاہ و جلال کا کعبہ تھا اسی کے ہاتھوں برباد ہوا تھا تاہم اس کی حکومت کے دست و بازو خواجہ رشید الدین اور علاؤ الدین جوینی تھے۔ خواجہ رشید الدین وزیر اعظم تھے اور در حقیقت کاروبار حکومت ان ہی کے ہاتھ سے انجام پاتے تھے۔ ہلاکو خان کے بعد جب اس کا بیٹا باقا آن خان بادشاہ ہوا تو اس کے دور میں بھی ان دونوں بھائیوں کا وہی احترام رہا۔ یہ اعتماد، یہ رتبہ ان لوگوں نے اسی وجہ سے حاصل کیا تھا کہ جس وفاداری، دیانت اور لیاقت سے یہ لوگ بادشاہی خدمت بجالاتے تھے، خود ہلاکو خان کے ہم قوم اور عزیز بجا نہیں لا سکتے تھے"۔(۸)

جن نازک حالات میں شبلی نے یہ مضمون تحریر فرمایا تھا وہ ہلاکو خان کے عہد حکومت میں پیش آنے والے حالات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ ہلاکو خان کے زمانے میں کچھ مسلمان مادی اغراض و مقاصد کے پیش نظر اس کے وفادار رہے مگر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس وفاداری کا سبب نہ مذہبی جوش تھا اور نہ ان مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق و کردار۔ اس لیے اس صورت حال کی تطبیق شبلی اور سرسید کے زمانے سے کرنا جائز ہے۔

شبلی نعمانی نے اسی مضمون میں یہ استدلال بھی کیا ہے کہ غیر قوموں کی اطاعت کے حوالے سے فقہی جواز موجود ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''اسلام کی تاریخ میں اکثر غیر قومیں اسلامی ملکوں پر قابض ہو گئیں۔ اس وقت ہزاروں فقہا اور علماء موجود تھے کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس کے متعلق فقہی احکام نہ مرتب کرتے، تاتاریوں نے جب تمام ایران اور عراق پر قبضہ کر لیا تو اس وقت جس قدر فقہ کی کتابیں تصنیف ہوئیں سب میں اس کے تفصیلی احکام موجود ہیں۔ اصل بحث یہ پیدا ہوئی کہ یہ ممالک دارالسلام ہوں گے یا دارالحرب۔ تمام فقہا نے بہ اتفاق لکھا جب تک اسلامی احکام یعنی نماز، روزہ وغیرہ جاری ہیں اس وقت تک دارالسلام باقی رہے گا اور مسلمانوں کی وہی حالت ہو گی جو اسلامی ملک میں ہوتی ہے''۔(۹)

امورِ بالا کے علاوہ بھی شبلی نے روایت پسند علماء سے اختلاف کیا اور تاریخ کو فلسفہ کی روشنی میں دیکھنے کی جدید راہ نکالی گویا ہم یہ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ شبلی کی تاریخ تصانیف علم کلام ہی کا پرتو ہیں۔ علم کلام سے شبلی نے جو کام لیا اس پر بحث و تبصرے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کے ان افکار کا جائزہ بھی لے لیا جائے جو زمانہ حاضر کے جدید مفکرین تاریخ کے بارے میں رکھتے ہیں شبلی سے پہلے تاریخ نویسی کا جو تصور موجود تھا اس کی رو سے بادشاہوں اور مقتدر طبقے کی تاریخی لکھی جاتی تھی۔ شبلی نے اس رجحان سے بھی بغاوت کی چنانچہ الفاروق کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

> ''رعایا کے اخلاق و عادات اور تمدن و معاشرت کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں آتا، فرمانروائے وقت کے حالات ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی فتوحات اور خانہ جنگیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ نقص اسلامی تاریخوں تک ہی محدود نہیں بلکہ کل ایشیائی تاریخوں کا یہی انداز تھا اور ایسا ہونا مقتضائے انصاف تھا''۔(۱۰)

شبلی کے اکثر نقادوں نے انہیں جدید اور قدیم روایات کے درمیان معلق قرار دیا ہے۔ شبلی چونکہ اپنے افکار و خیالات کی وجہ سے قدیم علماء سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اور مذہبی جوش کی

وجہ سے انہیں سر سید سے نظریاتی اختلاف تھا اس لیے یہ غلط فہمی عام ہوئی جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> "شبلی علماء میں مقبول نہ ہو سکے باقی رہے جدید تعلیم یافتہ حضرات سو انہیں شبلی کی ماضی پرستی سے قدرتاً کچھ دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ تحریک خلافت کے عارضی وقفے کے سوا ان لوگوں میں شبلی نامقبول ہی رہے"(۱۱)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے کو شبلی کے حق میں تاریخی فیصلہ مان لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جدیدیت محض ایک طرزِ فکر کا نام ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے تو خود جدیدیت جو کہ لامحدود وسعت کی حامل اصطلاح ہے سکڑ کر رہ جائے گی۔ شبلی نہ صرف اپنے افکار و خیالات کی وجہ سے جدید تھے بلکہ اپنے طرزِ اظہار میں بھی جدت رکھتے تھے مگر یہ ہمارا موضوع نہیں اس لیے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شبلی کے رجحانات ماضی سے وابستہ ہونے کے باوجود جدید تھے۔ روحانیت کے باب میں ابو الکمال سید عبدالحکیم صاحب دسنوی کے نام لکھتے ہیں:

> "سیرۃ نبویؐ کے متعلق روحانیت سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اگر اخلاق اور تقدس نفس مراد ہے تو لازمہ نبوت ہے بلکہ نبوت اس کا نام ہے۔ اس میں کیونکر کوئی شخص کمی کر سکتا ہے اور اگر اور کچھ مراد ہے تو تحریر فرمائیے۔ آج کل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لئے بہت سے الفاظ تراشے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں۔ فلاں شخص عالم ہے لیکن دیندار نہیں ہے لیکن انہی دینداروں کو مہینوں دیکھا ہے کہ نماز فجر کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ باوجود اس کے ان کی دینداری اور روحانیت میں ذرا برابر فرق نہیں آتا"۔(۱۲)

واقعہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سے تصویر کا ایک رخ دیکھنے کے عادی رہے ہیں لہذا ہم نے شبلی کو بھی ایک مولوی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی مگر مولویوں نے ان پر ان کی جدت پرستی کی وجہ سے فتویٰ تکفیر لگا کر انہیں مذہب سے خارج کر دیا اور جدت پرستوں نے انہیں ماضی پرست سمجھ کر رد کیا مگر ہمارے خیال میں شبلی ماضی پرست نہیں بلکہ وہ جدید علوم و فنون کی روشنی میں ماضی کی بازیافت چاہتے تھے اور مسلمانوں کو منتشر خیالی سے نکال کر ایک مرکز پر لانا چاہتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "اس وقت مسلمان سخت پراگندہ اور پریشان خیال اور پریشان عمل ہو رہے ہیں کسی خاص مرکز پر ان کو لانا ہے ورنہ ہر طرف سے بھٹکتے آخر بالکل برباد ہو جائیں گے"۔(۱۳)

مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کے لیے انہوں نے اگرچہ تاریخ و فلسفے کا سہارا لیا مگر کہیں بھی وہ عقلیت پرستی سے دامن نہیں چھڑا سکے۔ اس عقل پرستی کا اظہار ان کی تصنیف کلام اور علم کلام میں ملتا ہے اور ان کے خطوط سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ انہوں نے معتزلہ کی حمایت ان کی عقل پرستی کی وجہ سے کی مگر اس کے باوجود وہ جدید و قدیم کے درمیان کیوں معلق رہے اس پر ظفر احمد صدیقی نے یوں تبصرہ کیا ہے:

"خالص ادبی حلقوں میں مولانا کی متکلمانہ حیثیت کے عدم اعتراف کا سبب یہ ہے کہ علم کلام اور اصنافِ ادب کے درمیان نہ تو کوئی نقطۂ اتصال ہے اور نہ براہ راست رابطہ پایا جاتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان میں ایک طرح کی مغائرت کا احساس پایا جاتا ہے اس لیے ادبی حلقوں میں علم کلام کی اصلیت و ماہیت، اہمیت و افادیت، اس کی تاریخ نیز اس باب میں دوسرے متکلمین کے پہلو بہ پہلو مولانا کی خدمات کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ دوسری جانب علماء کے حلقے میں متکلم شبلی کی غیر مقبولیت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کے کلامی نظریات عام علماء کے نظریات سے مختلف ہیں اور وہ اس فن کے بعض مباحث میں روش عام سے ہٹ کر چلے ہیں۔ اس لیے علماء کا طبقہ ان کے متکلمانہ اقوال و افکار کو چنداں قابل التفات تصور نہیں کرتا"۔ (۱۴)

اس مقتدر رائے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی یورپ کی پیروی کریں یا مذہبی تاریخ لکھیں وہ جدید ہیں اور روش عام سے ہٹ کر چلنے کی وجہ سے ہی علماء نے انہیں مذہبی مصلح کے طور پر قبول نہیں کیا۔ شبلی کی عقل پرستی یا جدیدیت کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ وہ معتزلہ کی حمایت پورے جوش و خروش سے کرتے ہیں۔ عبد الحکیم دسنوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"قرآن شریف پر نقطے حجاج بن یوسف نے لگائے اور کسی نے یہ نہ کہا کہ حجاج پر قوم کو بھروسہ نہیں بلکہ وہی منقط قرآن ہے۔ بلاغت کا پورا فن جس سے قرآن مجید میں ہر جگہ کام لیا جاتا ہے جاعظ عبد القاہر جرجانی سکاکی کا بنایا ہوا ہے۔ یہ سب معتزلی تھے کسی نے نہیں کہا کہ ان پر قوم کو اعتماد نہیں، تفسیر کشاف تمام محدثین تک پڑھتے تھے حالانکہ اس میں اعتزال بھرا ہوا ہے"۔ (۱۵)

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی مذہبی عقائد کی تعبیر و تشریح بڑی حد تک عقلی دلائل سے کرنے کے قائل تھے مگر اس کے باوجود انہیں جدید مفکرین اپنی صف میں اس اعتماد اور یقین سے شامل نہیں کرتے جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ شبلی تمام تر جدید افکار کے باوجود اہل یورپ یا مستشرقین کی پیش کی ہوئی اس تصویر سے مطمئن

نہیں ہو سکتے تھے جو ان مستشرقین نے مسلمانوں کے مشاہیر و اکابر اور بالخصوص پیغمبر اسلامؐ کی دنیا کو دکھائی تھی۔ اپنے ایک مضمون تزک جہانگیر میں وہ لکھتے ہیں:

> "یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی، سیہ کاری کے واقعات کو اس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا کہ خود ہم کو یقین آ چلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے"۔(۱۶)

شبلی کے ان خیالات کو نو آبادیاتی نظام کے خلاف ردِ عمل بھی کہا جا سکتا ہے مگر مقامِ افسوس ہے کہ شبلی نعمانی کو اگر جدید مفکر کی حیثیت سے زیر بحث لایا گیا تو ان کے جدیدیت یا نو آبادیاتی نظام کے ردِ عمل پر ہی اصرار کیا گیا۔ ان افکار کو کلیتاً نظر انداز کر دیا گیا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ، خلفائے راشدینؓ اور سلاطین اسلام کو شبلی مستشرقین کی نظر سے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے انہیں سر سید سے اختلاف ہوا۔ کیونکہ سر سید محض مستشرقین کی پیروی یا تقلید پسند کرتے تھے جبکہ شبلی نے اپنے خیالات کا آزادانہ طور پر اظہار کیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شبلی ورقِ سادہ نہ تھے کہ ہر جائز و ناجائز بات پر سر تسلیم خم کرتے انہیں ایک مخصوص مذہبی ماحول میسر آیا تھا جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کو تاریخ کا صحیح رخ دکھا کر صحیح سمت اختیار کرنے کی تلقین کر رہے تھے مگر چونکہ مسلمان مستشرقین کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کی وجہ سے بدعقیدگی کا شکار ہو چلے تھے۔ اس لیے شبلی نے جدید انداز سے مسلمانوں کو مذہبی تاریخ سے روشناس کر کے نہ صرف ان کے عقائد درست کرنے کی کوشش کی بلکہ شاید پہلی بار اجتہاد کا دروازہ بھی کھولا اور اس کوشش میں حتی الامکان یورپ کی بے اعتدالیوں کے مقابلے میں اعتدال پسندی کی روش اختیار کی وہ لکھتے ہیں:

> "اگرچہ میں نے واقعات میں اسباب و علل کے سلسلے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس باب میں یورپ کی بے اعتدالی سے احتراز کیا ہے۔ اسباب و علل کے سلسلے پیدا کرنے کے لیے اکثر جگہ قیاس سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے مورخ کو اجتہاد اور قیاس سے چاہ نہیں لیکن یہ اس کا لازمی فرض ہے کہ وہ قیاس اور اجتہاد کو واقعہ میں اس قدر مخلوط کر دے کہ کوئی شخص دونوں کو الگ کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔
>
> اہل یورپ کا عام طرز یہ ہے کہ وہ واقعہ کو اپنے اجتہاد کے موافق کرنے کے لیے ایسی ترتیب اور انداز سے لکھتے ہیں کہ وہ واقعہ بالکل ان کے اجتہاد کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور کوئی شخص قیاس اور اجتہاد کو واقعہ سے الگ نہیں کر سکتا"۔(۱۷)

شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی بھی اسی مقصد کے پیش نظر لکھی کہ متشرقین نے پیغمبر اسلامؐ کے حوالے سے جو غلط افکار و خیالات پھیلا رکھے تھے ان کی تردید کر کے صحیح اسلامی فکر کو نہ صرف زندہ کریں بلکہ جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی کر دیں۔ شبلی کی سوانح عمریوں اور سیرۃ النبیؐ کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے طوالت کے خوف سے ہم ان مباحث کو قلم انداز کرتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ شبلی نعمانی کے افکار کا مطالعہ صرف سیرت اور تاریخ کی کتب کے حوالے سے نہ کیا جائے بلکہ ان کے ان افکار و خیالات کو سمجھنے کی بھی کوشش کی جائے جن کا اظہار انہوں نے خطوط ، مقالات اور کلام اور علم کلام میں کیا۔ جب شبلی نعمانی کے افکار و خیالات کا مطالعہ ان دونوں پہلوؤں سے کیا جاتا ہے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ شبلی اگر ایک اسلامی مفکر کی حیثیت سے جدید تھے اور ''پیروی عقل خداد'' کی تلقین کرتے تھے تو مغربی اقوام کی پیروی اور غیر اقوام کی پیروی میں جدید تر تھے۔

حوالہ جات

۱۔ فہیم اعظمی، ڈاکٹر، جدیدیت کا زمانی و مکانی تعین، مشمولہ جدیدیت کا تنقیدی تناظر، مرتبہ اشتیاق احمد، لاہور، بیت الحکمت، ۲۰۰۶ء، صفحات ۸۰۔۸۱

۲۔ شمیم حنفی، ڈاکٹر، جدیدیت اور نئی شاعری، مشمولہ ایضاً، ص ۱۷

۳۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی۔ انجمن ترقی اردو ۱۹۷۲ء، ص ۲۵۸

۴۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی مرتبہ سید سلیمان ندوی، جلد اول، اعظم گڑھ، مکتبہ معارف ۱۹۳۸ء، صفحات ۱۶۵۔۱۶۶

۵۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی مرتبہ سید سلیمان ندوی، جلد اول، اعظم گڑھ، مکتبہ معارف ۱۹۳۸ء، ص ۱۶۴

۶۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی مرتبہ سید سلیمان ندوی، جلد اول، اعظم گڑھ، مکتبہ معارف ۱۹۳۸ء

۷۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی مرتبہ سید سلیمان ندوی، جلد اول، اعظم گڑھ، مکتبہ معارف ۱۹۳۸ء، ص ۱۶۰

۸۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی مرتبہ سید سلیمان ندوی، جلد اول، اعظم گڑھ، مکتبہ معارف

۱۹۳۸ء، صفحات ۱۶۲۔۱۶۳
۹۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی مرتبہ سید سلیمان ندوی، جلد اول، اعظم گڑھ، مکتبہ معارف ۱۹۳۸ء، صفحات ۱۵۹۔۱۶۰
۱۰۔ شبلی نعمانی، الفاروق، اعظم گڑھ، مکتبہ معارف ۱۸۹۸، ص ۳۹
۱۱۔ سید محمد عبد اللہ، ڈاکٹر، سر سید اور ان کے نامور رفقاء، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۸، ص ۳۱۰
۱۲۔ شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی، جلد اول، مرتبہ سلیمان ندوی، اعظم گڑھ، مکتبہ معارف، ۱۹۲۸ء، ص ۲۵۸
۱۳۔ شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی، جلد اول، مرتبہ سلیمان ندوی، اعظم گڑھ، مکتبہ معارف، ۱۹۲۸ء، ص ۲۶۱
۱۴۔ ظفر احمد صدیقی، شبلی اور علم الکلام، مشمولہ المعارف، جلد نمبر ۳۹، شمارہ ۷ تا ۹، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۴۲
۱۵۔ شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی، ص ۲۸۴
۱۶۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی، ص ۹۷
۱۷۔ شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۴۶